قلبِ سلیم کی تلاش

تالیف

مفکرِ اسلام
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

ایچ۔ یم، حسین ٹرسٹ
H. M. Husain Trust
Email: hmhamuwash@yahoo.com
Cell: +91 7095168679

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول

رجب المرجب ۱۴۳۸ھ اپریل ۲۰۱۷ء

نام کتاب: ..... قلب سلیم کی تلاش

تالیف: ..... مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

تعداد اشاعت: ..... دو ہزار

کمپوزنگ: ..... عاقب حامد، لکھنؤ

صفحات: ۱۶

قیمت: ..... ۲۰ روپے

باہتمام:

انجینئر محمد عثمان حیدرآبادی

انتساب:

سید رشید احمد حسنی رحمۃ اللہ علیہ اور ''بوا'' رحمۃ اللہ علیہا

(والدین ماجدین مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی،

مولانا سید محمد واضح حسنی ندوی مدظلہ)

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ-0522-2741539

دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی-09807240512

ناشر

ایچ-ایم، حسین ٹرسٹ

H. M. Husain Trust

Email: hmhamuwash@yahoo.com

Cell: +91 7095168679

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قلبِ سلیم کی تلاش

حاضرین! حضرت مولانا عبدالباری صاحب جن کو ہم مدظلہٗ دامت برکاتہٗ کے الفاظ سے یاد کرتے تھے اب ان کے لیے ہم مرحوم ومغفوراور رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ استعمال کررہے ہیں۔ یہ رحمت کے الفاظ ہیں اور جن دعائیہ الفاظ کے استعمال کے لوگ عادی ہیں، اللہ تعالیٰ کی میزان میں وزن کے اعتبار سے یہ الفاظ وقیع ہیں۔ زندگی فانی ہے چاہے جتنی طویل ہو۔

اللہ کا شکر ہے کہ انھوں نے بہت طویل زندگی پائی۔ اگرچہ قلبی تعلق اور جذبات کا فیصلہ اور تقاضہ یہ ہے کہ ایسی قابل احترام اور محبوب شخصیت کی زندگی کتنی ہی طویل ہو، طویل نہیں معلوم ہوتی، اور جب بھی ان کی آخری منزل آجائے تو افسوس ہی ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی اپنے عنفوان شباب میں اس دنیا سے رخصت ہوجائے تو غم زیادہ ہی ہوتا ہے، لیکن جو اپنی عمر طبعی پوری کرکے اس دنیا سے چلا جائے تو کسی قدر تسکین ہوتی ہے، جو الفاظ ہم ان کی زندگی میں استعمال کرتے تھے ان کا استعمال کرنا بھی ہمارا اخلاقی فرض اور اپنے تعلق کا اظہار تھا، لیکن ان الفاظ کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی میزان میں نتیجہ اور قدر وقیمت کے اعتبار سے وہ الفاظ زیادہ وزنی ہیں جن کی نسبت رحمت الٰہی سے ہو، اس لیے کہ یہ زندگی تو حقیقت میں باعثِ رحمت ہی ہے ایک مومن کے نقطۂ نظر سے بھی اور حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے بھی، یہ زندگی تو زحمتوں کا مجموعہ ہے اس لئے رحمت بہرحال زحمت ہے اور وہ چیز جو رحمت کا

ذریعہ بن جائے اس چیز کے مقابلہ میں جو زحمتوں کو ساتھ لائے بہر حال قابل ترجیح ہے، اس لیے طبعی طور پر ہم کو کتنا ہی غم ہو ان الفاظ کے استعمال کرنے پر ہم کو تسکین ہونی چاہیے کہ خدا کے فضل و کرم سے اپنے عقیدے اور ایمان اور آثار و قرائن کے اعتبار سے بھی ہم ان کو اللہ کی رحمت کا مستحق سمجھتے ہیں اور ہم اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے لیے یہ الفاظ استعمال کریں۔

میرا ان سے ایک طرح کا خاندانی اور ذاتی تعلق تھا اور خاص طور پر میرے برادر محترم ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ سے ان کا ایسا گہرا تعلق تھا جیسے حقیقی بھائیوں کا سا تعلق ہوتا ہے۔ اور اس شہر لکھنؤ میں شاید ان سے زیادہ عزیز دوست و رفیق ان کا کوئی نہ تھا، آخر عمر تک وہ ان کو یاد کرتے رہے، اور پھر مجھ کو ان سے استفادے کا بھی موقع ملا اور ان کی شفقت کی نظر مجھ پر ہمیشہ رہی۔ اس بنا پر میں ان کے احساسات اور نظریات سے واقف رہا ہوں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ وہ جلسۂ تعزیت کے حق میں نہیں تھے۔ اور وہ ان تمام رسمی جلسوں اور تقریبات کو ناپسند کرتے تھے جن کا ثبوت قرنِ اول اور صحابہ کرامؓ کی زندگی میں نہ ملے اور ان کا شرعی ثبوت مشکل ہو جائے۔ اس لحاظ سے مجھے بہت تردد ہوا کہ یہ جلسہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، لیکن اس کے بعض ایسے مفید پہلو سامنے آئے کہ جن کی بنا پر ہم نے اس کو مفید سمجھا اور انہیں پہلوؤں کی طرف آپ لوگوں کو متوجہ کرنا ہے۔

پہلے تو ان کا مختصر سا تعارف کرا دوں کہ ہمارے نوعمر طلباء کو ان کی تصنیفات اور ان کے علوم سے استفادہ کا موقع نہیں ملا اور تقریباً سات سال سے صاحب فراش تھے اور کچھ فاصلے کی وجہ سے جانا بھی نہ ہوتا ہوگا، اور ہمارے بہت سے بھائیوں کو ان کی زیارت بھی نہ ہوئی ہوگی، اس لیے میں ان کا تعارف کرا دوں پھر ان پہلوؤں کی طرف متوجہ کروں گا جو ہمارے لیے بہت ہی سبق آموز بلکہ پیغام ہیں، ان کی زندگی کے یہ پہلو اتنے درخشاں ہیں کہ بہت کم ان کے معاصرین کی زندگی میں درخشاں ہوں گے۔

مختصر تعارف تو یہ ہے کہ گدیہ ضلع بارہ بنکی کے ایک انصاری اور بہت شریف

خاندان کے وہ فرد تھے۔ ان کے والد صاحب حکیم عبدالخالق حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلیؒ سے جو حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے بعد بزرگان سلف کی یادگار اور علوم شریعت کے جامع اور اس کے آخری نمونہ تھے ارادت کا تعلق رکھتے تھے، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے خود سنایا کہ جب میں پیدا ہوا تو میرے والد صاحب مجھے لے کر مولانا محمد نعیمؒ کے پاس گئے اور کہا حضرت اس کا نام رکھیے تو مولانا نے فرمایا خالق باری تمام کردونا، خالق باری کتاب کا نام تھا تو ان کا نام عبدالخالق تھا اور ان کے بیٹے کا نام عبدالباری اس لیے خالق باری تما کردو تو عبدالباری نام رکھا، مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے ابتدائی تعلیم اس زمانے کے شرفاء کے دستور کے مطابق گھر پر پائی، اس کے بعد ندوۃ العلماء میں جس کا قیام ابھی چند سال پہلے ہوا تھا داخلہ لیا۔ مولانا عبدالباری صاحبؒ کی ولادت ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء کی ہے تو گویا جب وہ پڑھنے کے لائق ہوئے ہوں گے تو ندوے کے قیام کو سات آٹھ سال ہوئے ہوں گے، تو ندوے میں درجہ سوم میں ان کا داخلہ ہوا، اور انھوں نے ساری تعلیم یہاں مکمل کی، اس تعلیم کے دوران میں ایک آدھ سال بعض مضامین میں کمزوری کی وجہ سے ان کے والد حکیم عبدالخالق صاحب نے ان کو نگرام مولانا محمد ادریس صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دیا، جو ہمارے شیخ التفسیر مولانا محمد اویس صاحب ندوی کے دادا تھے، وہ ہمیشہ شکر گذاری کے ساتھ کہتے تھے کہ وہاں جانے سے مجھے بڑا فائدہ ہوا، دینی فائدہ بھی اور علمی اور روحانی فائدہ بھی اور استعداد میں قوت استحکام پیدا ہوا، اس کے بعد پھر ندوے آئے، اس زمانے میں یہاں علامہ شبلی کا دور تھا، شروع ہی سے ان کی پیشانی پر ذہانت کے نمایاں آثار تھے، اس لیے مولانا شبلیؒ کی نظر جن ہونہار طالب علموں پر پڑی ان میں سے مولانا عبدالباری صاحب بھی تھے، یہاں انہوں نے تعلیم کی تکمیل کی اور تعلیم کے دوران میں علامہ شبلیؒ اور ان کا ربط خاص رہا، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ کے بعد ان کو علامہ شبلیؒ کی مجلس میں اختصاص حاصل تھا اور مولانا شبلیؒ کی دور بین نگاہ نے پہچان لیا تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہونہار اور آگے چل کر طبقہ علماء کا نام روشن کرنے والا ہوگا۔

مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کی خصوصیت یہ تھی کہ ذہانت کے ساتھ انھوں نے ادبی ذوق بھی پایا تھا اور یہی چیز مولانا شبلیؒ کی بارگاہ میں تقرب کا ذریعہ بنی، اور خاص طور پر فلسفے اور علوم عقلیہ سے مولانا کو مناسبت تھی اور اس وقت یہاں پر بہت ہی جید اساتذہ مسند درس پر متمکن تھے، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹیؒ، مولانا شیر علی صاحبؒ وغیرہ ہندوستان کے صاحب درس اساتذہ یہاں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، مولانا عبدالباری صاحب نے یہاں سے باقاعدہ فراغت حاصل کی اور سند لی۔ ان کو فلسفہ کا خاص ذوق تھا جب فلسفۂ جدید کے حملے ہو رہے تھے علم کلام پر اور عقائد پر اور عقائد میں تزلزل آ رہا تھا اور علامہ شبلیؒ اس ہراول دستے کے بھی قائد تھے، جو اس طوفان کے مقابلہ کے لیے سینہ سپر تھا تو مولانا عبدالباری صاحب نے بھی اسی مضمون کا انتخاب کیا کہ اس راہ سے دین کی بھی خدمت ہو سکتی ہے اور علم کی بھی خدمت ہو سکتی ہے۔

پھر انھوں نے فلسفۂ جدید کا گہرا مطالعہ کیا، انگریزی تعلیم جو یہاں ندوے میں حاصل کی تھی اس سے بھی فائدہ اٹھایا، مگر وہ کافی نہیں تھی اس لیے انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے جو ان سے عمر میں دو تین سال چھوٹے تھے (اللہ ان کی عمر میں برکت دے کل وہ جنازہ کی نماز میں بھی شریک تھے یہ حسن اتفاق ہی تھا) تو ان سے انھوں نے انگریزی کو ترقی دینے کی کوشش کی، اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ان سے عربی میں مدد لی اور اس طرح یہ دونوں متبادل اسناد ہیں اور ہر ایک دوسرے کا شاگرد ہے، پھر انھوں نے اپنے والد صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی انگریزی کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور علی گڑھ جانا چاہتے ہیں تو والد صاحب نے جو سراپا دیندار ہی تھے اور حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے تربیت یافتہ تھے اس زمانہ کے بزرگ اگر انگریزی پڑھنا جائز بھی سمجھتے ہوں تو کوئی نیک عمل نہیں سمجھتے تھے تو مولانا عبدالباری صاحب نے مجھ سے کئی بار کہا کہ میرے والد صاحب نے کہا کہ میں اس کار خیر میں مدد نہیں کر سکتا اور انھوں نے ہاتھ اٹھا لیا۔ تو مولانا شبلیؒ نے علی گڑھ غالباً اس وقت نواب وقار الملک کا دور تھا ان کو ایک خط لکھ دیا کہ یہ

بہت ہونہار نوجوان ہیں اور ان کو فلسفہ سے خاص شغف ہے آپ ان کو اجازت دیں تو وہاں پر کلاسز کو اٹینڈ کر سکیں اور فلسفے کے مضمون میں شریک ہوں تو بعض انتظامی دقتوں کی وجہ سے یہ نہیں ہو سکا تو پھر مولانا شبلیؒ نے ان کو کشمیر مقبول احمد صاحب قدوائی جو وہاں کمشنر مالیات یا ریلوے منسٹر تھے بھیجا تو انھوں نے وہاں طویل قیام کر کے اپنی انگریزی کو بڑھایا ان کی انگریزی ایسی ہوگئی تھی کہ جب وہ پونا کے ڈکن کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے تو انھوں نے خود فرمایا کہ میں انگریزی میں حافظ کا کلام پڑھانے لگا۔ پھر انھوں نے فلسفہ کا مطالعہ بھی بہت بڑھا لیا اور انگریزی بھی ترقی پاتی رہی۔ یہاں تک کہ فلسفہ کے ایک اچھے صاحب فکر عالم کی حیثیت سے ان کا تعارف ہوا، اس زمانہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی غالباً احمد آباد میں اس وقت وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کہلاتی تھی تو اس کے جلسے میں انھوں نے اپنا ایک معرکۃ الآرا اور تاریخی مقالہ پڑھا جو ''مذہب وعقلیات'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور جو بقول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ''اسلام کے دفاع کا ایک آہنی قلعہ ہے'' اور بقول نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے اس رسالہ کو پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا کہ ''اس شخص کے ہاتھ پر فلسفہ مسلمان ہوگیا ہے۔ لوگوں کے ہاتھ پر فلسفی مسلمان ہوتے ہیں لیکن اس شخص کے ہاتھ پر تو فلسفے نے کلمہ پڑھا ہے۔''

جب وہ کئی سال تک پونا کے ڈکن کالج میں فارسی کے استاد رہے اور ان کی قابلیت کا سکہ قائم ہوگیا تو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کو ایک فلسفہ کے استاد کی ضرورت تھی تو غالباً مولانا صدر یار جنگ کی خواہش سے وہ وہاں بلا لیے گئے، یہ وہ زمانہ تھا جب کسی یونیورسٹی میں کوئی کسی اعلیٰ ڈگری کے بغیر وہاں اسٹاف میں نہیں آسکتا تھا گویا ان کا تقرر ایک ناممکن سی بات تھی۔

لیکن مولانا عبدالباری صاحب ندوی اپنے علم کے زور اور اپنی قابلیت کے اثر سے وہاں استاد مقرر ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں ان کے علم کی دھاک بیٹھ گئی اور

دارالترجمہ سے ان کا تعلق قائم ہوا اور انھوں نے وہاں بڑے مفید کام انجام دیے اور ان کی ایک معرکۃ الآرا کتاب ''فہم انسانی'' کے نام سے شائع ہوئی اور برکلے کا ترجمہ کیا یہ سب فلسفے کی کتابوں کے کامیاب ترین تراجم کا نمونہ ہیں۔ ایک طرف تو تحریر کی شگفتگی اور قلم کی روانی جوان کو مولانا شبلی سے ورثے میں ملی تھی اور ندوے کی دین تھی پھر اودھ کا شگفتہ ادبی ذوق اور ذہانت اور اس کے ساتھ علم کی سنجیدگی اور مطالعہ کی گہرائی ان سب نے مل کر ان کے تراجم کو نمونہ کی حیثیت دے دی، اور وہ وہاں مقبول ہوئے اور اس شعبے کے صدر بھی ہو گئے اور اس وقت کے لائق ترین فلسفہ کے طالب علم بہت چمکے اور کامیاب ہوئے جیسے ڈاکٹر میر ولی الدین جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر رضی الدین یہ سب ان کے شاگرد ہیں، ہوسکتا ہے کہ میرے حافظے نے غلطی کی ہو لیکن بہر حال انھیں کے دور کے لوگ ہیں۔

اس وقت جامعہ عثمانیہ میں دو استادوں کا جو خالص عالم تھے سکہ بیٹھا ہوا تھا گویا طوطی بولتا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ یہ دونوں صحیح معنی میں یار غار کہے جاسکتے ہیں۔ دونوں نے وہاں ایک مسجد میں حجرہ بنایا تھا اس لیے یار غار کہنا صحیح ہوگا، دونوں کی زندگی ایک دوسرے میں پیوست ہوگئی تھی، ایک طرح سے سوچنا، ایک ساتھ کھانا، ایک ساتھ ہوا خوری کے لیے نکلنا، مشترک عادات، مشترک خیالات، مشترک مقاصد، اور ایسا اتحاد خیال جیسا مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا عبدالباری صاحبؒ ندوی کا تھا کسی مدرسے میں کم دیکھا گیا ہے۔

مجھے وہ دور یاد ہے جب وہ چھٹیوں میں آیا کرتے تھے تو ہمارے یہاں پابندی سے آتے جمعہ کی نماز ہماری مسجد میں پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے اور دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھاتے تھے۔ مولانا مناظر احسن بھی مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور بھائی صاحب بھی۔

حیدرآباد میں بڑی عزت اور وقار کے ساتھ انھوں نے اپنی ملازمت کے دن پورے کیے اور دونوں بڑے عزت و وقار کے ساتھ اپنے اپنے وقت پر پہلے مولانا عبدالباری

صاحب پھر مولانا مناظر احسن صاحب وظیفہ یاب ہوئے۔

یہ دونوں بزرگ عربی مدرسوں کے سند یافتہ تھے، مولانا گیلانیؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور مولانا عبدالباری ندویؒ آپ کی اسی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل۔

یونیورسٹیوں میں جامعہ عثمانیہ کا معیار سب سے بلند تھا اس کے حلقہ تدریس میں ایسے قابل اساتذہ جمع ہوگئے تھے کہ اس کی مثال ہندوستان کی کسی دوسری یونیورسٹی میں نہیں تھی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر الیاس برقی، پروفیسر ہارون خاں شروانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے لوگ۔

اس عثمانیہ یونیورسٹی میں خالص عربی مدرسے کا فاضل جس کے پاس کسی بھی یونیورسٹی کی سند نہیں صرف اپنی قابلیت کے بل بوتے پر تمام یونیورسٹی پر چھایا رہا، مجال نہیں تھی کہ کوئی شخص وہاں یہ کہہ دے کہ کوئی تحقیقاتی کمیشن بیٹھے اور دیکھے کہ کس کے پاس کون سی ڈگری ہے۔ کوئی بولتا تو مولانا عبدالباری صاحب کے بولنے سے پہلے وائس چانسلر اس کا منھ بند کر دیتا۔ اور کہتا کہ ہمیں فخر ہے مولانا عبدالباری پر اور مولانا گیلانی پر۔

اے میرے عزیزو! انھوں نے عربی مدرسے کی سند لی تھی۔ یہ نہیں کہ سندوں کا ڈھیر اور پی ایچ ڈی کرنا ضروری ہو انھوں نے کبھی یہ سوچا تک نہیں حالانکہ وہ بہت آسانی کے ساتھ وہاں ڈاکٹر بن سکتے تھے نہ معلوم کتنوں کو انھوں نے ڈاکٹر بنایا ہوگا۔

ایک بات ان سے یہ سیکھنے کی ہے عزیزو! کہ اصل چیز آدمی کی قابلیت ہے کسی بھی فن میں امتیاز پیدا کرلو، وہ جو فارسی کا مصرعہ ہے کہ ع

''کسب کمال کن کہ عزیزے جہاں شوی''

تم نحو میں کمال پیدا کرلو، مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے ایک رسالہ لکھا ہے ''مذہب وعقلیات'' ساٹھ ستر صفحے کا بھی مشکل سے وہ رسالہ ہوگا، اس کی علمی دنیا میں ایک دھاک بیٹھ گئی، آج بھی اس کو پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کتنی گہری نظر رکھتا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے ایک مرتبہ یہ رسالہ پڑھا تو کسی سے کہا کہ یہ ''یہ شخص عارف معلوم ہوتا ہے'' یہ سند اس شخص کی ہے جو عارف باللہ تھا اور اپنے زمانے کا سرخیل مشائخ۔

یہ بات لکھ لو کہ یہ سب خیالی طلسم ہیں کہ جب تک ہمارے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہ ہو اس وقت تک ہم کچھ نہیں کر سکتے، دو مثالیں ہمارے سامنے ہیں اور دونوں اسی درسگاہ سے تعلق رکھتی ہیں، ایک مولانا عبدالباری صاحب ندوی جن کے پاس صرف ندوے کی سند تھی اور وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ فلسفے کی سب سے اونچی کرسی سے وظیفہ یاب ہوئے اور دوسری مثال ہے ہمارے محبوب استاد شیخ خلیل عرب ندوی جن کی عربیت کا سکہ ایک زمانہ میں ہندوستان میں رواں تھا، ہم سب انھیں کے رہین منت ہیں اور میں تو ان کا پروردہ احسان ہوں جیسے کوئی بچہ الف، بے سے شروع کرتا ہے اسی طرح میں نے عربی زبان اور عربی ادب نثر و نظم سب انھیں سے پڑھا۔ وہ ندوے کے فارغ تھے ان کے پاس بھی صرف ندوے کی سند تھی، اچھے اچھے باخبر ندویوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ ندوے کے باقاعدہ فارغ التحصیل فاضل تھے۔ وہ کلکتہ میں ڈھاکے میں پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں خدمت انجام دیتے رہے اور ان کے علمی رعب کا یہ عالم تھا کہ انگریز وائس چانسلر اور شعبوں کے سربراہ تک ان کے سامنے شاگردوں کی طرح بیٹھتے تھے۔ ایک بات مولانا عبدالباری صاحبؒ کی زندگی سے یہ سیکھنے کی ہے کہ اصل چیز آدمی کی قابلیت مطالعہ اور محنت ہے وہ اس پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئے اور کہا ہو کہ کاش میں ڈگری یافتہ ہوتا۔

میں نے دو نام ہمیشہ ایک ساتھ پڑھے تھے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی، میں ان دونوں کو بی اے سمجھتا تھا، اس لیے کہ ایک زمانے میں مولانا عبدالماجد صاحب اپنے نام کے ساتھ بی اے لکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس سلسلہ میں ایک صاحب سے میری بڑی بحث ہوئی وہ کہہ رہے تھے کہ مولانا عبدالباری صاحب بی اے ہیں اور میں کہہ رہا تھا کہ ان کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے۔

بھائیو! دوسرا پہلو جو ہمارے لیے قابل استفادہ ہے اور ہماری آنکھیں کھولنے کے

لیے کافی ہے وہ یہ ہے کہ اتنا بڑا فلسفی اتنا بڑا رمز داں رمز شناس، ایسا متکلم، اتنا بڑا ذہین شبلیؒ کا مایہ ناز شاگرد، ندوے کا ایک روشن خیال فاضل۔ لیکن اس کے بعد جو چیز ان کی زندگی میں دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ انھوں نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ اپنی اصلاح کریں بلکہ اپنے کو مبتدی نہیں بلکہ ایک انجان آدمی تصور کر کے معالج کے حوالہ کر دیں اور اس کا طفل مکتب بن جائیں اس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کریں۔

یہ توفیق تو ہمارے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے دو آدمیوں کو دی ہے ایک علامہ سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے مولانا عبدالباری ندویؒ جو اعلیٰ علمی مقام پر پہنچ گئے تھے۔ امام غزالیؒ کی طرح، امام غزالی تو حجۃ الاسلام تھے۔ وہ لقب ان کے لیے مخصوص و مستقل ہے، ان کی زندگی کا ایک نمونہ تھا کہ وہ نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد، مورخین نے لکھا ہے کہ دربار خلافت سے ان کی مجلسیں آنکھیں ملاتی تھیں اور دو سو طلباء نہیں بلکہ فارغ التحصیل فضلاء ان کے درس میں بیٹھتے تھے۔ اور **قال ابو حامد، یقول ابو حامد** کا ہر طرف چرچا تھا، اس وقت انھوں نے اپنی یہ کمزوری محسوس کی کہ حسیات و بدیہات پر میرا جس درجہ کا یقین ہے غیبیات پر اس درجے کا یقین نہیں جب تک غیبیات پر اس درجہ کا یقین نہ ہو، میرا ایمان مکمل نہیں، تاریخ دعوت و عزیمت میں مفصل لکھا گیا ہے **المنقد من الضلال** میں تفصیل سے ہے میرا مشورہ ہے کہ ہر طالب علم اسے پڑھے۔ امام غزالیؒ کو پڑھانا کیا بلکہ بولنا بھی مشکل ہو گیا، ہاضمہ متاثر ہوا ان پر سخت بے چینی طاری ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ اسلام کو نظر لگ گئی کہ ایک ایسا نادر روزگار، فاضل یگانہ کی درس سے طبیعت اچاٹ ہو گئی ہے، اور کسی فکر یا طلب میں مبتلا ہو گیا ہے۔

طبیبوں نے دیکھ کر کہا کہ ایسی چیزیں ان پر مستولی ہو گئی ہیں کہ جنھوں نے پورے نظام جسم کو متاثر کر دیا ہے اور کسی کام کے نہیں رہے۔ انھوں نے صحرا نوردی کی، برسوں تک خاک چھانتے رہے پھر اس کے بعد جامع اموی دمشق میں بیٹھ کر حقیقت کی تلاش میں مراقبے کرتے رہے بہت مجاہدے کیے، آخر میں جب حقیقت کا سرا ان کو مل گیا تو

وہاں سے واپس آئے اور پھر ملاحدہ اور باطنیہ کی تردید میں کتابیں لکھیں۔ پہلے درس دینا اور لکھنا کچھ اور تھا اب کچھ اور ہے۔

ہمارے اس دور مادیت والحاد میں امام غزالی کی اس علوئے ہمت اور حسن طلب کی دو مثالیں ہمارے حلقہ میں ہمارے سامنے گذری ہیں ایک مولانا سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک صاحب نے جو ہائی کورٹ کے جج رہ چکے تھے انھوں نے تعجب سے کہا کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ علامہ علامہ شبلیؒ کے شاگرد ہو کر مولانا تھانویؒ کے مرید ہو گئے؟

مولانا تھانویؒ کو ان کا مرید ہونا چاہیے تھا اور ندوی حلقہ میں بھی اس پر چہ می گوئیاں رہیں لوگوں نے سید صاحب کو خطوط لکھے۔ خود سید صاحب نے ہمارے سامنے کہا عجیب بات ہے کہ لوگ مجھے بڑا بھی مانتے ہیں اور احمق بھی سمجھتے ہیں اور مجھے مشورہ بھی دیتے ہیں کہ آپ کو تھانہ بھون نہیں جانا چاہیے تھا۔ آپ نے ندوہ کی توہین کی اور علامہ شبلیؒ کے نام کو بٹہ لگایا ان کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد اور بے شمار محققانہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کے بعد آپ دیوبند کے ایک عالم کے پاس گئے۔

امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ سے کسی نے کہا کہ آپ ایسے شخص کے درس میں بیٹھتے ہیں جو آپ کے درس میں بھی شریک ہونے کے قابل نہیں تو انھوں نے جوب دیا، یا بنی انما یجلس الانسان حیث یجد صلاحۃ آدمی وہاں پر بیٹھتا ہے جہاں دل کا فائدہ نظر آتا ہے۔

کیا ہمیں دل کے علاج کی ضرورت نہیں؟ ہمیں اپنے دل کو حرارت سے بھرنے اور نور یقین سے بھرنے کی ضرورت نہیں؟ یہ مثالیں ہمارے سامنے کی ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ جو ہمارے عہد کے عظیم ترین مصنف تھے، یہ میں مسجد میں بیٹھ کر کہہ رہا ہوں، ان کی تصانیف مقدار کی حیثیت سے بھی کچھ کم نہیں اور تنوع کی حیثیت سے بھی کچھ کم نہیں اور پھر قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی کچھ کم نہیں، وہ اور مولانا عبدالباری ندویؒ دونوں مولانا

اشرف علی تھانویؒ کے پاس پہنچے، کوئی مدرسی اور گروہی عصبیت حائل نہیں ہوئی، کوئی شہرت کا جو بہت بڑا فتنہ ہے، جن کی شہرت سے مستشرقین بھی مرعوب تھے اور اپنے سوالات کے جوابات ان سے مانگتے تھے عربوں نے بھی ان کا لوہا مان لیا وہ تھانہ بھون گئے اور پھر اس طرح اپنے کو ڈال دیا کہ حضرت تھانویؒ کو یہ کہنا پڑا۔

از سلیمان گیر اخلاص عمل
داں تو ندوی را منزہ از دغل

مجھے کم معلوم ہے کہ کسی شیخ نے اپنے ایک مسترشد کی ایسی مدح کی ہو جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ہے اور ان کو اتنی جلدی خلافت دی کہ ان کے پرانے اصحاب کو تعجب ہوا اور بعض کو ملال بھی ہوا ہوگا۔ حضرت تھانویؒ کا جب وصال ہوا اس وقت حضرت مولانا الیاسؒ اور سید صاحبؒ یہیں مقیم تھے۔ سید صاحبؒ کو اس کا اتنا رنج و ملال ہوا کہ بچوں کی طرح روتے تھے کہ گویا سایہ پدری اٹھ گیا۔

اسی طرح مولانا عبدالباری صاحب ہمارے لیے قابل تقلید مثال ہیں، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی دونوں گئے تو حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ آپ حضرات کو زیادہ مناسبت مولانا حسین احمد مدنی سے ہے، آپ ان سے بیعت ہو جائیں ویسے خدمت کو میں حاضر ہوں۔

جہاں تک مولانا عبدالباری صاحب کا تعلق ہے مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ حضرت تھانویؒ سے ان کا تعلق ایسا ہی تھا جیسے ایک ادنی مرید کا ہوتا ہے، وہ ان کو اپنا حقیقی شیخ مانتے تھے پھر مولانا تھانویؒ نے کچھ عرصہ کے بعد اطاعت و انقیاد کا مادہ دیکھ کر ان کو اجازت دی۔

بھائیو! یہ دو سبق ہیں، یہ دو پہلو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہیں، مولانا عبدالباری کی زندگی سے یہ دو سبق لیں کہ، ایک تو کمال کا پیدا کرنا۔ رہے ڈگری والے تو وہ بے ہتھیار کے سپاہی اپنے کو محسوس کرتے ہیں چاہے وہ کسی یونیورسٹی میں صدر شعبہ ہو جائیں، یا وائس

چانسلر بن جائیں۔

دوسرا سبق یہ لینے کا ہے بھائی سب کچھ کر لیجیے مگر جیسے کسی نے کہا ہے ۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

اور ع

قال را بگذار نزد حال شو

یہ حقیقت ہے، یہ آج سمجھ لو جب بھی خوش قسمت ہو، دو برس بعد سمجھ لو تب بھی خش قسمت ہو، اور مرنے سے پہلے اس وقت سمجھو گے تب بھی اچھا ہے، لیکن کرنے کا وقت نکل چکا ہوگا۔ نہ محنت کر سکو گے نہ کہیں آجا سکو گے۔

بھائیو! جیسے پہلے ہمارے عربی مدارس کا رواج تھا مجھے خوب تاریخ معلوم ہے عربی مدارس کی، کہ مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ کا حلقہ درس اس وقت وہ مرکز بنا ہوا تھا یہاں سے لے کر ایران، ترکستان تک کہ ذہین وجید الاستعداد طالب علموں کا، حضرت مولانا لطف اللہؒ کے یہاں جو طالب علم پڑھتا تھا وہ گنج مراد آباد جا کر مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ سے روحانی تعلیم حاصل کرتا تھا، یہاں دماغ کو روشن کرتا تھا تو وہاں دل کو روشن کرتا تھا، دیوبند میں جو طالب علم پڑھتا تھا تو وہ سیدھے گنگوہ چلا جاتا تھا، وہاں جا کر وہ تکمیل کرتا تھا، جب ان کا دور ختم ہوا تو وہ رائے پور جاتا تھا یا پھر تھانہ بھون جاتا تھا۔

مولانا عبدالحیؒ کے درس میں جو لوگ شریک ہوتے تھے وہ سیدھے گنج مراد چلے جاتے تھے۔ یہ عام بات تھی۔ میں دعوت پیری مریدی کی نہیں دے رہا ہوں، حالانکہ پیری مریدی عیب نہیں ہے، صاف کہتا ہوں ہرگز میرے نزدیک عیب نہیں ہے، اگر عیب ہوتا تو مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ الحمدللہ سب روشن خیالوں میں سب سے زیادہ روشن خیال ہیں میں خود روشن خیال ہوں، روشن خیالوں نے جتنی دنیا دیکھی ہے ان سے زیادہ میں نے دنیا دیکھی ہے، میں اس کے بعد بھی پیری مریدی کا قائل ہوں، اور عامل

بھی ہوں، میں شرماتا نہیں ہوں اور اپنے لیے ضروری سمجھتا ہوں، اس کے باوجود بھی میں آپ کو پیری مریدی کی دعوت نہیں دے رہا ہوں، آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں دلالی کر رہا ہوں، میں کہتا ہوں کہ اپنی روحانی پیاس بجھانے کی فکر کرو، اپنے ایمان ویقین کو ناقص سمجھو اور اپنے کو کامل نہ سمجھو، اگر یہ خلا رہا تو سب سے بڑا خلا رہا قال ابو ملکیة ادرکت ثلاثین من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم مامنھم احد الا کلھم یخاف النفاق علیٰ نفسہ، امام بخاریؒ کی تعلیقات میں ہے، اس کی خوبی یہ تھی کہ جس نے ان کو چمکایا اور ان کی کتابوں کو مقبولیت بخشی اور اللہ کے نزدیک جوان کے درجے ہیں وہ اللہ ہی جانتا ہے انھوں نے اس خلا کو محسوس کیا، اور دونوں اپنے اپنے وقت پر گئے اور انھوں نے بالکل اس کی پروا نہیں کی، یہ علامہ سید سلیمان ندویؒ ہیں اگر یہ کسی یونیورسٹی میں پہنچ جائیں تو اس کے لیے فخر کی بات۔ وہاں کے وائس چانسلر اور پروفیسر ملنے کے لیے آئیں، اگر یورپ جائیں تو وہاں کے مستشرقین آئیں استفادہ کے لیے، مولانا عبدالباری ندویؒ اگر سوچتے کہ میں فلسفے کے دریا میں تیرا ہوا ہوں اور میں مولوی اشرف علی تھانویؒ بہشتی زیور کے مصنف کے پاس جاؤں یہ نہیں ہوسکتا یہ سب فروعی باتیں ہیں کہ یہ کون ہے یہ کون ہے، اس کی کتنی کتابیں ہیں کتنے درجے کی کتابیں ہیں ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں ہمیں صرف مطلب ہے ہمارا کام نکلے اور ہم اس خطرے سے بچ جائیں جو درپیش ہے، لاکھوں کروڑوں برس کی زندگی وہاں صاف طور پر کہہ دیا گیا، الا من اتی اللّٰہ بقلب سلیم، وہاں صرف سوغات چاہیے جو قلب سلیم لے کر آئے، قلب سلیم کی تلاش میں وہاں یہ لوگ گئے۔

بس میرے بھائیو میں ختم کرتا ہوں۔ یہ دو چیزیں میں کوئی تعین نہیں کرتا، میں پیری مریدی کی رہنمائی نہیں کرتا میں کسی چیز کی تبلیغ نہیں کرتا میں اس اجمالی بنیادی ضرورت کا احساس دلاتا ہوں کہ ہم کو، آپ سب کو زندگی کے ہر دور میں اپنی تکمیل کی ضرورت ہے اور روحانیت کی ضرورت ہے وہ روحانیت ہمارے اندر پیدا ہو بجائے اس

کے ہم تحقیر کے ایک ملا کے پاس چلے گئے اور ان کے مرید ہوئے، عالم بن جانے کے بعد، کلمہ پڑھنے کے بعد، کیا قرآن وحدیث میں کوئی چیز کم ہے اور کیا قرآن وحدیث میں اصلاح نفس کے لیے کچھ کم ہدایات ہیں، آپ ان باتوں اور شبہوں میں نہ پڑیں، آپ یہاں جس طرح بھی اپنی اصلاح وتربیت کا جو بھی انتظام ہو جب بھی ہو سکے فراغت کے بعد اس کی طرف آپ توجہ کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے۔ حضرت مولانا عبدالباری صاحبؒ کے درجات کو بلند فرمائے۔ بحیثیت عالم کے بھی اور اس درسگاہ کے فاضل کی حیثیت سے بھی اس پر ہم سالہا سال فکر کریں گے اور بحیثیت مسلمان کے بھی اس کا ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے لیے دعائے مغفرت کریں اور ایصال ثواب کریں اپنے اپنے طور پر، ایک مرتبہ سورہ یٰسین ہی پڑھ کر ایصال ثواب کریں جب یہ تحفہ ان کے پاس پہنچے گا کہ یہ ہماری درس گاہ کے طالب علموں کی طرف سے ہے بہر حال ان کو خوشی ہوگی ان چیزوں کی وہاں پر کچھ قدر ہوگی یا نہیں کیا پتہ بہر حال ان کو خوشی ہوگی، یہ سعادت کی بات ہے اور تعلق کی بات ہے۔

دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اور اس ہفتہ میں جانے والے سب مرحومین کی، اس مہینے میں جانے والے سب مرحومین کی اور اس سال اور اس صدی میں جانے والے سب مرحومین کی اور سابقین واولین سب کی مغفرت فرمائے ان سب کے درجے بلند فرمائے، ان کی سیئات سے درگذر فرمائے۔ اللہ تعالیٰ تمام مومنین ومومنات کی مغفرت فرمائے۔

ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل قلوبنا غل للذی آمنوا ربنا انك غفور رحیم۔

تمت

(ماخوذ ''تعمیر حیات'' ۱۰ و ۲۵ فروری ۱۹۷۶ء)